eISSN:2073-3674
pISSN:1991-7813

اِکیسویں صَدی کے معاصر افکار: پاکستانی اُردُو ناول تجزیاتی مطالعہ

An Overview of the 21st Century Urdu Novel

مصباح منیر، اسکالر پی ایچ ڈی اُردو، جی سی ویمن یونی ورسٹی، سیال کوٹ
Misbah Munir, Ph.D., Scholar, Department of Urdu, GC Women Universtity, Sialkot.

ڈاکٹر سبینہ اویس، اُستادِ شعبہ اُردو، جی سی ویمن یونی ورسٹی، سیال کوٹ
Dr. Sabina Awais, Assistant Prof. Department of Urdu, GC Women University, Sialkot.

ABSTRACT

In 21st Century the genre of Urdu is in its revolution period which is a piece of its development. It restored after a brief time of dormant.
In Pakistan, after the Year 2000AD, many Urdu novels have been composed. Another style, approach, method, designs and characters of Urdu novels introduced in 21st century. In this essay the novel of 21st century is discussed. The modern trends which are adopted by writers are also studied. The thematic and stylistic techniques are also discussed in this essay. Prominent Urdu novelist are writing good novel in present era. Their's 21st century work is appreiatable. The introduction of an important novel is also given in following essay.

KEYWORDS: Century, Genre, Revolution, Restored, Brief, Dormant, Composed, Approach, Method, Design, Characters, Introduced.

کلیدی الفاظ: صدی، طرز / انداز، انقلاب، دوبارہ بحال کرنا، مختصر اور جامع تحریر، خوابیدہ، ترتیب دینا، نزدیک ہونا، طریقہ، نقش / خاکہ، کردار، تعارف کرانا۔

اُردو ناول پر گہری نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ناول اپنی بے شمار خصوصیات کی بنا پر اُردو اَدب میں ایک خاص مقام حاصل کر چکا ہے۔ ناول اطالوی زبان کے لفظ "ناویلا Novella" سے اَخذ کیا گیا ہے اور انگریزی زبان میں مخفف Novel کے ساتھ اُردو زبان میں مفہوم ہے، ناول انگریزی زبان سے اُردو میں داخل ہوا ہے۔ ناول ایک نثری فرضی کہانی ہے، جس میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر امجد طفیل:

> "ناول دراصل زندگی کو اس کی کلیت میں بیان کرنے کا فن ہے۔ ناول اس دُنیا میں انسانی صورتِ حال کو بیان کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ناول اپنے آغاز ہی سے انسان اور انسانی معاملات سے جڑا رہا ہے۔ ہر دور میں ناول نے انسانی زندگی کے بارے میں اہم سوال اُٹھائے اور ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے ناول نگار یہ کوشش موضوعی سطح پر کرتا ہے وہ معروضی اور تجرباتی شواہد تلاش کرنے کی بجائے انسان کے باطن میں جھانکتا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اور انسانی معاملات اس سے کس طرح جڑے ہیں؟[(1)]"

اکیسویں صدی میں ناول نے سب سے زیادہ تخلیقی سفر طے کیا ہے اور بہت نمایاں صنف کے طور پر منظر عام پر آ رہا ہے۔ ایک طرف ناول سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نئے رنگ لیے سامنے آیا، تو دوسری طرف ناول نے مواد، موضوع، ہیئت، تکنیک اور اُسلوب کے کئی سنگِ میل عبور کیے ہیں۔

ہمارا موضوع اِکیسویں صدی میں تخلیق ہونے والے اُردو ناولوں کا ایک تجزیاتی جائزہ پیش کرنا ہے۔ اِن چند سالوں میں جہاں پہلے سے موجود ناول نگاروں نے بہت سے نئے مُوضوعات ناول میں پیش کیے ہیں، وہیں پر دُوسری طرف بہت زیادہ نئے ناول نگار بھی اپنے عُمدہ ناولوں کے ساتھ اس سفر کا حِصّہ بنے ہیں۔ گزشتہ صَدی کے اہم ناول نِگاروں میں مستنصر حسین تارڑ، انیس ناگی، اکرام اللہ، حسن منظر اور اختر رضا سلیمی وغیرہ شامل ہیں۔ جنھوں نے اِکیسویں صدی میں بہترین ناول پیش کیے ہیں۔ دورانِ صَدی ہندوستان اور پاکستان کے کئی ناول نِگار اپنے عُمدہ ناولوں کے ساتھ مَنظر عام پر آئے۔ پاکستان میں وحید احمد، مرزا اطہر بیگ، اختر رضا سلیمی، خالد فتح محمد، محمد عاصم بٹ، محمد حمید شاہد، ریاظ احمد، خواتین میں نیلم احمد بشیر، طاہرہ اقبال، آمنہ مفتی، آمنہ ریاض اور بھارت میں مشرف عالم ذوقی، عبدالصمد، سید محمد اشرف اور خالد جاوید وغیرہ شامل ہیں۔

اِس ایک مضمون میں اِکیسویں صَدی کے تمام ناول نِگاروں اور اُن کے ناولوں کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔ بلکہ چند ناولوں کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔ یہ ناول نگار انسان کے مسائل و مصائب اور پریشانیوں کو مُوضوع بنا کر اس صَدی کے انسان کا حال واضح کرتے ہیں۔

اِکیسویں صَدی میں بہت سے ناول نِگار ہیں جنھوں نے کئی ناول لکھے جیسے کہ مستنصر حسین تارڑ، اختر رضا سلیمی، مرزا اطہر بیگ، اکرام اللہ، اشفاق احمد، انیس ناگی، بانو قدسیہ، مرزا حامد بیگ، حسن منظر، خالدہ حسین، ریاظ احمد، سید نقوی، شمس الرحمن فاروقی، شیر از دستی، طاہرہ اقبال، علی اکبر ناطق، فہمیدہ ریاض، عاصم بٹ، محمد حفیظ خان، محمد حمید شاہد، نجم الحسن رضوی، نجم الدین رضوی اور نیلم احمد بشیر ان میں سے کچھ ناول نِگاروں کے چار یا اس سے زیادہ ناول منظر عام پر آ چکے ہیں لیکن کچھ ناول نِگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک یا دو ناول ہی لکھے لیکن یہ ایک ناول بھی معیاری ناول رہا اور ناول کی اس صَدی میں اپنا مقام بنانے میں کام یاب ہو گیا۔

اکیسویں صدی میں اُردو میں لکھے گئے ناول کی تعداد متعدبہ ہے۔ اس لیے اس مقالہ میں سات ناولوں کا انتخاب کیا گیا۔ جن میں مستنصر حسین کا "قلعہ جنگی"، "خس و خاشاک زمانے"، حسن منظر کا "العاصفہ"، "حبس"، "وبا"، "دَھنی بخش کے بیٹے"، محمد حمید شاہد کا "مٹی آدم کھاتی ہے" شامل ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی" کا موضوع امریکہ کا وہ حملہ جو افغانستان پر کیا گیا اور اس حملے کے بعد اِنسانوں اور قوم کی صُورتِ حال کو اس ناول کے ذریعے بیان کیا گیا۔ ناول میں سات کردار شامل ہیں جو کہ ہیں "عبد الحمید"، "جانی واکر"، "عبد الوہاب"، "ہاشم میر"، "ابو طالب چی چی"، "گل شیر"، "اللہ بخش" اور "مرتضٰی بیگ" ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور بہت اہم کردار "گھوڑا" ہے۔ ناول کی کہانی کا کا آغاز گھوڑے سے ہوتا ہے ناول کی کہانی انہیں کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔

"گھوڑا ہے"

"کہاں؟"

"اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں"

"وہاں گھوڑا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ لاشوں کو کھانے آیا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ ہے۔۔۔ سچ مچ کا گھوڑا ہے۔۔۔ کان لگا کر سنو۔۔۔"

تہ خانے میں اترتی پہلی تین سیڑھیوں پر چاندنی بچھی تھی۔۔۔ ان سب کی نظریں ان تین سیڑھیوں تک اُٹھی ہوئی تھیں۔

"اُوپر کوئی نہیں"

"ہے۔۔۔ میں نے خود سُنا ہے۔"

وہ کان لگائے اتنی دیر منتظر رہے کہ اونگھنے لگے اور پھر ایک مدھم سی ہنہناہٹ تہ خانے کی سینتیس سڑھیاں اترتی اِن کے کانوں تک آئی اور آتے آتے مزید مدہم ہو گئی۔

میں نے کہا تھاناں کہ ہے۔۔۔ سنو۔۔۔ اگر ہم اسے زندہ پکڑ لیں گے تو۔۔۔ کھا سکتے ہیں۔۔۔

"گھوڑا حلال ہوتا ہے؟"

"اگر نہیں ہوتا تو کیا تم نہیں کھاؤ گے؟"

"کھاؤں گا۔۔۔"

"تم بتاؤ عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین۔۔۔ تم سے بہتر حلال اور حرام کی تمیز کسے ہو سکتی ہے۔"

"ہم تو تمہارے پیروکار ہیں۔"

"مکروہ ہے۔۔۔ مگر حرام نہیں۔۔۔ کھایا جا سکتا ہے۔[2]"

ان ساتوں کرداروں کے علاقے، پسِ منظر، ماحول الگ الگ ہوتے ہیں، اس کے باجود وہ سب کردار اپنے حالات معاشی اور معاشرتی سے تنگ آکر جہاد میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کردار کے بعد جو بات ذہن میں آتی ہے وہ ہے ناول میں موجود مکالمہ نگاری جو کسی بھی کردار میں جان ڈال دیتا ہے۔ مکالمہ نگاری ایک ڈرامائی صنف ہے اور بطور ڈرامانگار مستنصر حسین تارڑ نے اس میں بھی بہت عمدہ مکالمہ نگاری کی ہے اور دوران مکالمہ بہت عمدہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جیسے:

"بھائی جی میری انتڑیاں بھوک سے خشک ہو کر گُچھا مچھا ہو گئی ہیں۔۔۔ ہاں جی۔۔۔ کل تک انتظار نہیں کر سکتا۔۔۔ جو بھی کرنا ہے آج ہی۔۔۔ ابھی کر لو۔۔۔ نہیں تو میں نہیں کل تک نکالتا۔۔۔ اللہ بخش کی آواز میں اتنی نقاہت تھی کہ وہ بار بار کھانستا اور اٹکتا تھا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" عبدالوہاب نے صرف اتنا کہا۔

"گھوڑے کو کون مارے گا؟" چی چی نے نہیں مرتضیٰ نے کہا۔

"تم۔۔۔ گل شیر"

"نہیں یارا۔۔۔ ہمارا طبیعت خراب ہے۔۔۔"

"کلاشنکوف چلانے کو جی نہیں چاہ رہا۔۔۔"

"بہانے نہیں بناؤ خان صاحب۔ گھوڑوں کے بارے میں تمہارا تجربہ وسیع ہے۔ تمہارا باپ بھی تو نواب کے بیمار گھوڑوں کو ہلاک کرتا ہوگا تو تم بھی کر سکتے ہو۔"

وہ تو خود نواب اپنے ہاتھوں سے مارتا تھا۔۔۔

پرائیوٹ جا کر مارتا تھا کہ ہمارا گھوڑا عزت دار جانور ہے۔ اس اصطبل میں لید صاف کرنے والا لوگ نہیں مارے گا۔۔۔

۔۔۔مرتضیٰ بیگ ہمارے چیچنیا میں گھوڑوں کو اولاد کے برابر درجہ دیتے ہیں بل کہ اس سے بھی بلند۔۔۔ اولاد کو مارنا مشکل ہوتا ہے۔۔۔

کوئی اور بے شک مار دے، خود مارنا مشکل ہوتا ہے۔۔۔

"جانی۔۔۔ عبدالحمید سلیمان فارسی۔۔۔ تم۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ جانی نے صرف اتنا کہا"

"کیوں نہیں؟"

"آئی لو ہارسز۔۔۔ آئی کینا ٹ شوٹ ہارسز۔۔۔"

"جانی اپنی مختصر اردو بھول گیا اور بھڑک کر اپنی امریکی انگریزی میں رواں ہو گیا۔ (3)"

اس طرح مستنصر حسین تارڑ کی مکالمہ نگاری کا ایک نمونہ دیکھیے:

"چی چی۔۔۔"

"ہا اللہ بخش۔۔۔"

یار میرے حلق میں سوکھا پھیل گیا ہے۔۔۔

دراڑیں پڑ گئی ہیں۔۔۔

مجھے پیاس مارتی ہے۔"

"تم اپنی نانی جان کے پاس نہیں گئے تھے؟"

بتایا تو ہے کہ وہ حربہ کام نہیں کرتا بھائی چی چی۔۔۔

تمہارے چیچنیا میں بڑے ندی نالے اور نہریں ہوں گی۔

پانی سے بھری ہوئی۔۔۔ ہیں؟ ٹھنڈی ٹھار۔۔۔

سینے میں ٹھنڈ ڈال دینے والی۔۔۔ ہم اِدھر سے فارغ ہو کر تمہارے ملخ چلیں گے چی چی۔۔۔"

"ہم ادھر سے کبھی فارغ نہیں ہوں گے اللہ بخش۔۔۔"

"خیال ہی خیال میں۔۔۔ نہیں"

"ہاں۔۔۔"

"بھائی۔۔۔ حسین کی پیاس اس سے زیادہ تھی۔۔۔؟"

"عقیدہ پیاس کو بڑھاتا ہے۔۔۔ اُس کا تو مول پڑ گیا۔۔۔"

ہماری پیاس تو رائیگاں جائے گی۔۔۔

اُٹھو۔۔ ہمت کرو۔۔۔[(4)]"

اس طرح اگر بات کی جائے ناول میں موجود بہترین منظر نگاری کی تو اس سے ناول کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ جیسے "ابو طالب چی چی" سے اپنی کہانی شئیر کرتا ہے تو اس دوران جو منظر قلم بند کیا گیا ہے وہ بہت عمدہ ہے:

"اس کا گاؤں چیچنیا کی بڑی آبادی والی بستیوں سے طویل فاصلوں پر داغستان کی سرحد کے قریب تھا۔ گاؤں کیا ڈھلوان چھتوں والے چند گھر تھے جو ایک تنگ وادی کے دھانے پر ہرے بھرے کھیتوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ سرما کے دو تین ہی ماہ وہ گھروں میں بند رہتے آگ پر جھکے رہتے اور ان کے چہرے دھویں سے سیاہ پڑ جاتے۔۔۔ ان کے گھروں کے دروازے مشکل سے ہی کھلتے کہ برف ان کی کمر تک آ جاتی۔۔۔ زیرِ زمین تہہ خانوں میں بند مویشیوں کو خشک چارہ ڈالنے اور ان کا دودھ دوہنے کے سوا انہیں اور کوئی کام نہ ہوتا۔۔۔ ان دوران دودھ۔۔۔ خشک پنیر اور کبھی کبھار خشک سبزیوں کا شوربہ اور روٹی ان کی خوراک ہوتی۔۔۔ سردیوں کے دوران ان کے دروازے برف کے بوجھ سے اتنی مضبوطی سے بند رہتے کہ انہیں کنڈی لگانے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی اور جب وہی دروازے آپس میں بھرنے لگتے ان کو چولوں میں سے رات کو آوازیں آنے لگتیں تو وہ جان جاتے کہ موسم سرما رخصت ہونے کو ہے اور باہر برف کا بوجھ کم ہو رہا ہے، پگھل رہا ہے۔۔۔ ایک کہاوت تھی کہ جب سردیوں میں دروازہ ذرا سا دھکیلنے سے کھل جائے تو اس کے اندر جو مہمان داخل ہوتا ہے وہ موسم بہار ہے۔۔۔[(5)]"

اسی طرح ایک اور جگہ بہترین منظر نگاری کے ذریعے وہاں کا ماحول بیان کرتے ہیں:

"اوپر بلند کہساروں پر برف پگھلتی تو ان کی تنگ وادی میں جھرنے اترنے لگتے اور جہاں کہیں کوئی چٹان ہوتی، وہ آبشار میں بدل جاتی۔۔۔ سنہری چونچ والے عقاب اپنے گھونسلوں سے نکل کر وادی پر پرواز کرنے لگتے۔ (6)"

مُستنصر حسین تارڑ نے اس ناول کے ذریعے اس اَمر کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ افغانستان کی اِس حالت کے ذمے دار اَن پڑھ جاہل قبیلے نہیں بلکہ وہ اہم طاقتیں ہیں جو نائن الیون کے حادثے کے نتیجے میں ہر طرح کی تباہی کی دعوت دے چکی ہیں اور اِن طاقتوں کے نزدیک اِنسانی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس ناول میں خاص طور پر ناول نِگار نے سیاست میں اُلجھنے کی بجائے اِنسانیت کی دردناک صورتِ حال کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول نِگار نے افغان وار کا انسانیت سوز واقعہ قلعہ جنگی بہت عمدہ طریقے سے اور مُنفرد اُسلوب میں بیان کیا ہے۔

"قلعہ جنگی" میں مصنف نے بہت معنی خیز حکایات کا استعمال کیا ہے جن کی مدد سے وہ بہت گہری بات بھی قاری تک آسانی سے پہنچاتے ہیں۔ ان میں سے چند حکایات درج ذیل ہیں:

"دُنیا چاہے کتنی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو، اسے چھوڑ کر خود قبر میں اُترنے کو جی نہیں چاہتا۔ (7)"

"عقل کا عمر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ (8)"

"باتیں کرنے والے ہی تو مرتے ہیں۔۔۔ جو چپ رہتے ہیں وہ کب مرتے ہیں۔ (9)"

مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول کی بدولت "قلعہ جنگی" کا دردناک واقعہ تاریخ کا حصّہ بن گیا ہے۔ ناول کے مطالعہ سے افغان جہاد اور جہاد میں حصّہ لینے والوں کی سُوچ، ان کے خیالات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ "قلعہ جنگی" اِکیسویں صدی میں ناول کی دُنیا میں ایک خوش گوار اِضافہ ہے۔

ناول "خس و خاشاک زمانے" میں 1930ء سے 2001ء تک کا معاشرتی اور سیاسی ماحول قلم بند کیا گیا ہے۔ ناول میں مُستنصر حسین تارڑ نے بہت سے ایسے متنازع موضوعات کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن پر پابندی ہے۔ جیسے جسم فروشی، نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والے اسلام دُشمن، حلال و حرام، ہم جنس پرستی وغیرہ۔ اس ناول میں مصنف نے واضح کیا کہ کِس طرح ترقی پذیر ممالک کو ترقی یافتہ ممالک نے اپنے ماتحت کیا اور یہ اپنے

فائدے کے لیے کچھ بھی کر گزرتے تھے۔ اس ناول کا آغاز 1920ء میں پنجاب کے دریا چناب کے علاقے گجرات اور گوجرانوالہ کے دیہاتوں سے ہوتا ہے۔ اس میں ذات برادری کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اِس ناول کے کردار نہال سنگھ اور بخت جہاں انسان کی فطرت میں موجود وحشی کے نمائندہ ہیں۔ محمد جہاں شائستگی اور عزت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناول کے کردار اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ یہ کردار جیتے جاگتے انسان کی طرح ہمارے سامنے ہیں۔ ناول کے خاص کرداروں میں "جہاں خاں"، "نہال سنگھ"، "امیر بخش" اور "پرنام سنگھ" ہیں، جنھوں نے دیہاتوں کے ماحول وہاں کے رسم رواج، تہذیب و ثقافت کو منفرد طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس طرح ناول نگار نے ان کرداروں کے زریعے سے کسانوں کی زندگی کو بھی بہت اچھے طریقے سے منظر عام پر لایا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ ناول کے مرکزی کرداروں سے لے کر مرکزی واقعات سب کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے:

> "وہ اپنی زمین کی کوکھ سے جنم لینے والے ہر بوٹے سے بھی گفتگو کرتا ہے۔ گندم کے ہر گوشے سے راز و نیاز کرتا ہے۔ جیسے ایک درویش کے جنگل کا ہر گل، بوٹا، ہر شجر اور ہر پتھر کلام کرتا ہے۔ ایسے ہی کسان کے ساتھ بھی گندم کا ہر خوشہ اور ہر بوٹا اس کی باتوں کے جواب میں چپ نہیں رہتا۔ جواب دیتا ہے، کلام کرتا اور یہی ہم کلامی اِن دونوں کی حیات کا سبب ہوتی ہے۔"(10)

دَراصل اِنسان فطرتاً خودغرض ہے اور اپنی "میں" کا دیوانہ ہے۔ تہذیب و معاشرت اور دین مل کر بھی اس کی فطرت کو تبدیل کرنے میں ناکام ہیں۔

"خس و خاشاک زمانے" مستنصر حسین تارڑ ان کے چالیس سال کے اَدبی سفر کا نچوڑ ہے۔ اس ناول میں وادی سِندھ کے تہذیبی ارتقا کو بہت منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تارڑ کا اُسلوب بلاشبہ دل آویز ہے۔ درختوں کے ناموں سے لے رسموں، کھیتوں، سواریوں اور پیشوں سب کو بہت دل آویز طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول کے تکلیف دہ اور دکھ بھرے حصوں کو بھی اس دل کو لبھانے والے انداز میں بیان کیا ہے۔ ناول میں جب لڑائی جھگڑا اور ہنگامہ کرنے والے ٹولے گاؤں میں پہنچ گئے تو مصنف نے اس ٹولے کو بارات کا نام لے کر وہاں کی عورتوں نے اس ٹولے کو دور گھروں کے اندر سے ہی کوسنا شروع کر دیا۔ ان کو بد دُعائیں دیتی اور لعنت بھیجتی رہی:

> "ویہڑے آن کھلوتے کنجر۔۔۔

کجراں دی آئی اے بارات۔۔۔
لج تہانوں نئیں۔۔۔(11)"

"خس و خاشاک زمانے" میں ناول نگار نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کئی بار کیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور استعمال بھی بہترین طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ ناول روایتی موضوعات سے ہٹ کر ہے۔ ناول میں ایک نہیں بلکہ کئی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ محمد انس اعوان ناول "خس و خاشاک زمانے" کے بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں :

"شہرہ آفاق ناول "خس و خاشاک زمانے" میں وہ نصف صدی کے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر اپنی تحریر میں صدیوں اور دہائیوں کے حالات و واقعات کو سمیٹ دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔۔۔ اس ایک ناول میں کئی خاندانوں کی، کئی نسلوں کی، کئی علاقوں کی، کئی شاخوں کی، کئی نظریات کی اور کئی تاریخی روایات کی ایک طلسماتی دُنیا آباد ہے۔ (12)"

حسن منظر کا یہ ناول "وَبا" کراچی میں پھیلی ہوئی ایک وبا پر لکھا ہوا ہے۔ "وَبا" ناول 2009ء میں لکھا گیا۔ اس ناول میں کراچی کی داستان بیان کی جہاں چیچک جیسی بیماری پھیلی اور پورا شہر اس وَبا سے بچنے اور چھٹکارا حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔ "وَبا" ناول میں ایسی تہذیب کی داستان بیان کی جس میں کوئی اس وبا سے لڑنے کو تیار نہیں۔

حسن منظر اس ناول میں لوگوں کے جادو ٹونے اور تعویز وغیرہ پر اندھے یقین کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہسپتال میں آنے والے لوگ اپنے مریض کو تب ہسپتال لے کر آتے ہیں جب ان کا مریض قرب المرگ ہوتا ہے اس سے پہلے وہ گھر میں رہ کر جادو ٹونے اور تعویزوں سے مریض کا علاج کر رہے ہوتے ہیں اور وہیں پر وہ لوگوں کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے لوگوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ کیسے وہ لوگ بھی طب کی بنیادی باتوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ حتی کہ ڈاکٹرز بھی۔ حسن منظر رقم طراز ہیں :

"کوڑھیوں کے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر سمیع اللہ چیچک کے ٹیکے پر اعتقاد نہیں رکھتے۔۔۔ ان کا کہنا ہے کہ۔۔۔ اگر کسی کو چیچک ایک بار ہو جائے تو پھر ساری عمر چیچک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔۔۔(13)"

لیکن ہسپتال کے گرد گھومتی یہ کہانی ناول نگار نے اس لیے بھی تحریر کی کہ لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا جاسکے کہ پاکستان میں صحت عامہ کی سہولیات کا کیا معیار ہے اور صحت عامہ کے شعبہ میں کیا کیا نقائص ہیں، کس طرح شعبہ صحت کو نظر انداز کر کے عوام

الناس کو نامکمل سہولیات دی جاتی ہیں۔ ہسپتالوں میں اور نہ ہی مکمل عملہ جس وجہ سے لوگ مجبوراً پرائیویٹ ہسپتالوں کا رُخ کرتے ہیں لیکن وہاں کے اخراجات کا بوجھ نہیں اُٹھاسکتے اور بیماری کے ساتھ سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔ حسن منظر "وبا" میں لکھتے ہیں :

> "رجسٹریشن ٹیبل ایک ہے ،نرسنگ اسٹاف ایک ہے ،اسفگمو مینو میٹر ایک ہے۔۔۔ اور اسی سے میں مریض کے سینے کو Auscultate کرتا ہوں۔"(14)

ناول "وَبا" 110 صفحات پر مُحیط ہے۔ یہ 110 صفحات اُداسی اور مایوسی سے بھرے ہوئے ہیں، مگر اس کے ساتھ ناول میں موجود جاذبیت ،ناول کے کردار، اس کا مرکزی خیال اور ناول کا پلاٹ اس قدر مضبوط ہے۔ کہ یہ قاری کو متاثر ضرور کرتا ہے اور اپنی سحر میں مبتلا کیے رکھتا ہے جب تک قاری مکمل ناول پڑھ نہ لے۔ ناول پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دنوں میں لوگ کس طرح ایک اَن دیکھے خوف میں مبتلا تھے اور یہ وَبا کس طرح ان کے اپنوں کو تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ "وَبا" نامی ناول کی خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں والدین، مریض کے گرد گھومتی نرسیں اور ڈاکٹر کا پریشان کن رویہ اور صحت عامہ کے مسائل اور لمحہ بہ لمحہ ہاتھ سے نکلتی زندگی اس بات کا پیغام دیتی ہے کہ کس طرح وَبا ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ حسن منظر "وَبا" میں چیچک سے متاثرہ مریض کی تشویش ناک حالت کا بھی اور اس کے ساتھ آنے والے لواحقین کا بھی جو پل پل مر رہے ہیں اور اس اُمید پر ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ شاید اب کوئی معجزہ ہو گا اور ہمارا مریض صحت یاب ہو کر اُٹھ کر بیٹھ جائے گا، یا آہستہ آہستہ موت کی وادی میں جاتے ہوئے اپنے پیاروں کو دیکھنے کا خوف ہر طرح کی صورت حال سے ہمیں بتاتے ہیں۔

ایسی کئی واقعات ہیں جو ناول میں موجود ہیں اور جن کو پڑھ کر انسان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل بھی روتا ہے۔ حَسن منظر کے ناول "وَبا" میں اُداسی اور مایوسی کبھی کبھار اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارے چاروں طرف صرف اور صرف خزاں ہے اور گہری اندھیری رات خاموشی سے اپنی طرف بلا رہی ہے لیکن ایک ادیب کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ خیر وشر کا مقابلہ جب بھی کرتا ہے تو عموماً فتح خیر کی ہوتی ہے۔ اس ناول میں بھی ڈاکٹر اور نرسوں کی محنت اور وقت کی پابندی اور اچھے رویوں کے ذریعے چیچک کی اس وَبا پر قابو پالیا۔ اس ناول کے آخر میں لوگ صحت یاب ہو رہے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کی محنت رنگ لے آتی ہے۔ حکومت بھی اس بات کو سراہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول میں موجود کردار ان کے گرد پھیلتی مایوسی اور بعد میں اُمید کی فتح مندی اس بات کا ثبوت ہے کہ

ناول "وَبا" ایک زندہ کتاب ہے جو ہمیشہ اپنے قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھے گی۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین کتاب ہے۔

ناول "العاصفہ" میں عرب ملک کے تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی حالات وواقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس ناول میں حسن منظر نے ہمیں ایک بالکل الگ طرح کی ثقافت سے متعارف کروایا ہے۔ ایک ایسی ثقافت جس کے کرداروں کے قول و فعل میں بہت تضاد ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "زید بن سعد" اپنی فیملی اور معاشرے کے بارے میں بتاتا ہے اور ان کو طنز کا نشانہ بھی بناتا ہے۔

حَسن منظر کا یہ ناول جو کہ عرب تہذیب کی نُمائندگی کرتا ہے۔ "العاصفہ" دراصل عربی صحرا کی آندھی کو کہتے ہیں۔ ایک ایسی آندھی جو اپنے اندر صرف اور صرف ریت سمیٹے ہوئی ہے۔ حسن منظر نے "العاصفہ" کو لغوی معنی کے ساتھ ساتھ استعاراتی معنی کے طور پر بھی استعمال میں لایا ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں عرب دُنیا کے رویوں اور ان کے سماجی حالات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسن منظر نے بھی "العاصفہ" کو بطورِ استعمار استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ سعودی عرب کی عورت بھی جبری رسم ورواج کا شکار ہوتی ہے۔ لوگوں پر اپنی بنائی ہوئی روایات کو مذہب کا نام دے کر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس طرح اس آندھی سے لوگ گھروں میں بند ہو جانے کی باوجود خود کو مکمل محفوظ نہیں کر پاتے، بالکل اسی طرح لوگ اس جبری مسلط کردہ رسوم وروایات سے بھی کافی حد تک نہیں بچ پاتے۔

یہ ناول دراصل انسانی رشتوں پر لکھا گیا ہے۔ جو کہ بنتے بھی ہیں اور ٹوٹتے بھی ہیں۔ ہمیشہ ایک جیسے بھی لگتے ہیں تو کبھی کبھی یہ تبدیل ہوتے بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن کسی بھی صورت میں یہ رشتے قائم رہتے ہیں۔ کبھی بھی ختم نہیں ہوتے یہ ناول بیٹے اور باپ کی کہانی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد بھی نہیں کرتے۔ دھوکہ دیتے ہیں۔ نفرت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا رہنا بھی مشکل ہے اور وہی پر دوسری طرف ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کو چھوڑنا بھی مشکل ہے۔ "زید" اپنے باپ سے شدید نفرت بھی کرتا ہے اور اس کو مار دینا چاہتا ہے۔ "زید" اور اس کے والد کے درمیان جو کھچاؤ ہے وہ بلاشبہ تکلیف دہ ہے۔ مگر یہ تناؤ اس خاص سماج کی مکمل عکس بندی کرتا ہے۔ مگر زید اپنے معاشرے کی اخلاقی، سماجی حدود کو توڑ کر زندگی نہیں گزار سکتا اور اس قدر شدید نفرت کے باوجود ناول کے آخر میں "زید" بتاتا ہے کہ :

"میرے فلیٹ کی دیواروں میں ایک واحد تصویر ولی ابنِ سعید یا ابوزید کی ہے۔[15]"

ناول "العاصفہ" کا اُسلوب سادہ اور دل کش ہے۔ ناول نگار نے مناسب الفاظ کا انتخاب کیا اور جملوں کا سٹرکچر ایسا بنایا ہے کہ ناول کا اُسلوب ایک طاقت ور اُسلوب کے طور پر سامنے آیا اور پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ تمام کردار و واقعات ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ جیسے حسن منظر لکھتے ہیں :

"میں گھر میں داخل ہوا تو سب صحن میں جمع تھے۔ دھیمی روشنی ایک کونے میں سے آ رہی تھی اور چاندنی میں سے سب پلنگوں پر بیٹھے تھے۔ وہ رات گرمیوں کی ایسی رات تھی جب اوس میں بھیگے ہوئے بچھونوں پر چھوٹے چھوٹے بچے سوتے ہیں بار بار کنمناتے ہیں اور عورتیں بیٹھی ہوئی سوئی سوئی سی لگتی ہیں۔ اس رات میں کوئی چاہے تو ساز بھی بجا سکتا ہے اور سے بری آواز والا بھی گائے تو بُرا نہیں لگتا۔[16]"

تاہم ناول میں ایک خاص عرب ملک کے بارے میں زید نام کے ایک کردار کے ذریعے حسن منظر نے اپنے خاص طریقہ تحریر اور خوب صورت کہانی کے ذریعے اپنے خیالات بیان کیے ہیں جو کہ قابل ستائش ہیں۔

حسن منظر کے ناولوں میں الگ الگ ممالک اور وہاں کی ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی طرح اِن کے ناول "حبس" کا موضوع بھی فلسطین ہے۔ حسن منظر کا یہ ناول ایک انسانی المیاتی صورت کو بہترین انداز میں پیش کرتا ہے۔

"حبس" ناول میں حسن منظر نے اسرائیل کے وزیر دفاع "ایرئیل شیرون" کے وقت نزع کا قصہ بیان کیا ہے۔ شیرون نے فلسطینیوں پر ظُلم و بربریت کے پہاڑ گرا دیئے تھے۔

"۔۔۔ کٹے ہوئے نرخروں سے خون کی پھنکار کی آوازیں آ رہی ہیں۔
دوسری آوازیں AK-47 Assault رائفلوں کے چلنے کی ہیں۔۔۔
بچوں کے رونے اور عورتوں کے چیخنے کی آوازیں وہاں سے اُٹھ رہی ہیں۔
انہیں گوشت کاٹنے والے چھروں سے کواشر کیا جا رہا ہے۔۔۔[17]"

شیرون کو گولہ باری کی آواز بہت سکون دیتی تھی۔ یہ اسرائیل کا سابق وزیر ہٹلر کا بہت دل سے احترام کرتا تھا۔ بستر مرگ پر پڑے شیرون کے جذبات کی تفصیل حسن منظر نے بہت بہترین انداز میں کی۔ شیرون صرف نفرت کرتا تھا۔ فلسطینیوں سے نفرت کرنے

والا شیر ون اور اس کی نفرت موت کے سامنے بھی نہیں جھکتی۔ اس ناول میں شیر ون کی ذہنی کش مکش اور اُتار چڑھاؤ کو قلم بند کیا گیا ہے۔ "حبس" کا پس منظر جدید اسرائیل کے دورِ تعمیر پر مُبنی ہے۔ یہ ناول شیر ون کے ان آٹھ سالوں پر محیط ہے۔ جو اس نے ہسپتال میں گزارے مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے والا شیر ون 4 جنوری 2006ء سے 11 جنوری 2014ء تک اذیت میں مبتلا رہا۔ ان آٹھ سالوں میں ماضی کے تمام واقعات اس کو بے سکون کیے رکھتے ہیں۔

2008ء میں شائع ہونے والا یہ ناول "دَھنی بخش کے بیٹے" میں تہذیبی کش مکش میں شدت اور پستے طبقوں کے مسائل کو اس ناول میں اُجاگر کیا گیا۔ تہذیبی و طبقاتی کش مکش اور جاگیر دارانہ نظام ، ہارنے کا ڈر اور بے بسی کا احساس برداشت نہ ہونے والے حالات اور حالات کو بدلنے کی خواہش ان دو حصوں میں ناول کو بانٹا گیا ہے۔ جاگیر دارانہ نظام اور جاگیر داروں کے ظلم اور مظلوم لوگوں کی برداشت کی حد ہی دراصل اس ناول کا موضوع ہے۔ ناول میں انسان کے نفسیاتی طریقے عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ اس کے مخفی خیالات کو وقتاً فوقتاً سفر کرتے دکھایا گیا ہے اور اس ناول میں حالات کو علیحدہ علیحدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

ناول کا آغاز کرداروں کے تعارف سے ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ کرداروں اور ان کی اندرونی کش مکش کو بیان کیا جاتا ہے اور پھر اسی کش مکش سے تنگ آکر حالات سے بھاگنے کی تگ و دو اور ناول کا اختتام الم ناک المیے کی صُورت میں ہوتا ہے۔

حَسن منظر نے بطور ڈاکٹر سندھ میں قیام کیا۔ جس وجہ سے وہ سندھ کے حالات و واقعات اور حقائق سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس ناول میں اُنہوں نے اس آگاہی سے کافی فائدہ اُٹھایا اور وہاں کے سیاسی حالات، سماجی و حکومتی اداروں، مذہبی اُمور، ان سب کے اور وہاں کے لوگ کِس قسم کے حالات میں زندگی گزار رہے تھے، اس حقیقت کو اُنھوں نے کہانی کی شکل میں پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حَسن منظر نے وہاں کے ماحول کی منظر نگاری بھی بہت تفصیل سے اور عُمدہ طریقے سے کی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار احمد بخش ہے جو کہ دھنی بخش کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ احمد بخش ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ دھنی بخش کا دوسرا بیٹا علی بخش ہے۔ احمد بخش عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود علی بخش سے زیادہ سمجھ دار اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ احمد بخش اپنے ارد گرد کے ماحول میں ہونے والے ظلم و جبر کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ لیکن اس ظلم و ستم کو روکنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ وہ لمبی لمبی تقاریر تو کرتا تھا مگر عملی اقدامات کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ آخر وہ ان

سب حالات سے تنگ آکر اور خوف زدہ ہو کر امریکہ چلا جاتا ہے اور وہاں وہ اپنے سرکل میں مشرق کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ امریکہ میں مشرقی ماحول کو بہت اچھا اور بہترین ثابت کرتا ہے۔ امریکہ میں احمد بخش اپنے طرزِ عمل یا گفتگو میں شدید معقولیت رکھ رکھاؤ یا منکسر المزاجی ظاہر کرنے والی شخصیت بن جاتا ہے اور اپنے ملک واپس لوٹنے پر بھی وہ اکیلا ہی رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی برائیوں، خامیوں سے کراہت محسوس کرتا ہے جسے ناول میں کچھ یوں لکھا ہے :

> "۔۔۔ آخر اس ملک کو بیماری کیا ہے جو پہلے دکان داروں کو لگی کہ تولتے کم ہیں، ناپتے کم ہیں۔ پھر سوسائٹی میں امن اور قانون نافذ کرنے والوں کو لگی اور ان سے پھیلتی پھیلتی انصاف گاہوں تک جا پہنچی۔۔۔"[18]

ناول نگار نے ناول کے کرداروں کے توسط سے ترقی یافتہ اور مظلوم پس ماندہ طبقے کا تقابلی موازنہ پیش کیا ہے۔ سندھ کی مکمل سیاسی، سماجی ہر طرح کے حالات کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے مغرب و مشرق کے معاشروں کے اختلافات کو اس ناول میں موضوع بنایا ہے۔ جہاں ایک طرف ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی خامیوں جیسے عورتوں کی جبراً شادیاں، غریب طبقے کی مجبوری اور جاگیر داروں کا ان کی مجبوریوں کا ناجائزہ فائدہ اُٹھانے تو دوسری طرف مغربی کلچر کی بے حسی اور جنسی بے راہ روی کو بھی کڑھے ہاتھوں لیا ہے۔ بلاشبہ حسن منظر کا یہ ناول "دھنی بخش کے بیٹے" ایک عُمدہ ناول ہے۔

محمد حمید شاہد بھی ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" بلاشبہ ایک بہترین ناول ہے۔ اس میں مشرقی پاکستان جو کہ ہمارے ملک کا وہ حصہ جو 25 سال ہمارا حصہ رہا اور پھر جُدا ہو گیا۔ یہ ناول ہماری قومی تاریخ کے زَخم کو ہرا کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں :

> ""مٹی آدم کھاتی ہے" اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مشرقی پاکستان / بنگلہ دیش کی حقیقت سے آنکھ ملانے کی کوشش رومان اور تشدد کو یک جا کر دیتی ہے۔ اسے محمد حمید شاہد کی بہت بڑی کام یابی سمجھنا چاہیے۔"[19]

حمید شاہد نے اِس ناول کو انسانی فطرت کے دو اہم جزو وفا اور ظُلم سے مِلا کر دکھایا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ناول تاریخ کا قصہ بننے کی بجائے انسانوں کے رویوں کا قصہ بن گیا۔ ایسا قصہ جس میں انسانی جذبات کی طاقت کو اور انسانی معاشرے کو متاثر کرنے والی سیاست کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں رشتے ناطے بنتے بھی اور ٹوٹتے بھی جاتے ہیں لیکن زندگی گزرتی جا رہی ہے۔

بلاشبہ اِکیسویں صدی میں ناولوں کا یہ تذکرہ مزید ناولوں کے تفصیلی ذکر کا متقاضی ہے۔ لیکن جیسا کہ شروع میں ہی عرض کیا گیا یہ موضوع اِتنا وسیع ہے کہ اس کو ایک مضمون میں سمایا نہیں جا سکتا۔

مذکورہ بالا جائزہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں یہ ناول اُردو ادب میں ایک بہت ہی طاقت ور صنف کے طور پر اُبھرے گا۔

حوالہ جات

1. امجد طفیل "اُردو ناول انیسویں صدی کے نصف اول میں"، مشمولہ: ساماہی "لوح"، کراچی، شمارہ تیرہ، چودہ، جنوری تا دسمبر 2020ء، ص: 138
2. مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2008ء، ص: 5، 6
3. ایضاً، ص: 37، 38
4. ایضاً، ص: 11، 12
5. ایضاً، ص: 68، 69
6. ایضاً، ص: 69
7. ایضاً، ص: 28
8. ایضاً، ص: 99
9. ایضاً، ص: 178
10. مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2014ء، ص: 308
11. ایضاً، ص: 326
12. https://daleel.pk/2020/01/31/127692
13. حسن منظر، وبا(ایک بیانیہ)، شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، 2009ء، ص: 11
14. ایضاً، ص: 41
15. حسن منظر، العاصفہ، شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، 2004ء، ص: 174
16. ایضاً، ص: 61
17. حسن منظر، حبس، شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی 2014ء، ص: 25

18. ایضاً، ص: 242
19. محمد حمید شاہد، مٹی آدم کھاتی ہے، اکادمی بازیافت، کراچی، 2007ء، ص: 15